

انسانی تہذیب کی تاریخ میں

اسلامی ثقافت کا مقام

شبیر احمد خان غوری - ایم۔ اے، ایل - ایل۔ بی

انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ میں بے شمار قوموں نے حصہ لیا ہے۔ مگر اس شرف کے ایک تہائی حصہ کے مستحق مسلمان ہیں جنہوں نے تاریخ کے ادوار ثلاثہ میں سے ایک پورے دور میں جب کہ دنیا "قرونِ مظلمہ" کی تاریکی میں غرق تھی، اپنی علمی و ثقافتی مساعی سے معمورہ عالم کے بڑے حصہ کو بقعہ نور بنائے رکھا۔ یہی نہیں، بلکہ اپنی ان محک کو کششوں سے جو علمی درشہ انہوں نے چھوڑا، اسی کی اساس پر بڑی حد تک تہذیبِ حاضر کی بنیاد پڑی۔

سطور ذیل کا مقصد صرف اسی تاریخی واقعہ کی توضیح ہے۔

(۱) انسانی ثقافت کی تاریخ کے ادوار ثلاثہ

دنیا کی ثقافتی تاریخ کو عموماً تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے: عہدِ قدیم، قرونِ وسطیٰ اور عہدِ حاضر۔ عہدِ قدیم: زمانہ ماقبل تاریخ سے ۵۲۹ء تک ممتد ہوتا ہے، جب کہ ایتھنز کا مدرسہ فلسفہ قیصر جیسٹینان کے حکم سے بند کر دیا گیا۔

قرونِ وسطیٰ: ایتھنز کے مدرسہ فلسفہ کی قفل بندی سے ۶۳۲ء تک باقی رہتا ہے جبکہ ڈیکارٹ کی (DISCOURS DE LA METHODE) شائع ہوئی۔

عہدِ حاضر: ڈیکارٹ کی "مقالات برمناسج" کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دور ہنوز چل رہا ہے۔

۲. اسلام کی ثقافتی سرگرمیوں کا زمانہ

مسلمانوں کی علمی و ثقافتی ترقی کا زمانہ ان ادوار ثلاثہ میں سے قرونِ وسطیٰ کے ساتھ منطبق

بنیوں کے

۱: ۱۶۲۶ء (جس سال مدرسہ فلسفہ کی قفل بندی کے ساتھ قرون وسطی کا آغاز ہوا) کے چالیس سال بعد اسلام کی بعثت ہوئی۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

ب: اسلامی علم و حکمت کی ترقی ۱۶۲۶ء بلکہ اس کے ایک صدی بعد تک جاری رہی، کیوں کہ ہر چند دیگر ممالک اسلامیہ کے اندر جو اس زمانہ میں سیاسی و معاشرتی انقلابات کا شکار بنے ہوئے تھے، علم و حکمت کا چرچا برائے نام ہی رہ گیا تھا، پھر بھی اسلامی ہند میں ان علوم کی ترقی برابر جاری رہی ۱۶۲۶ء میں ڈیکارٹ کی ”مقالات برہمنہ“ شائع ہوئی، جس کے ساتھ عہد جدید کا افتتاح، اور قرون وسطی کے ثقافتی جوہر کا اختتام ہوا، اور اسی سال شاہجہاں تخت نشین ہوا جس کے عہد حکومت میں ملاحمود جو پوری نے ”شمس بازغہ“ لکھی جو واقعی ہندوستانی اسلامی فلسفہ کا آفتاب درخشاں ہے (اور مقالات برہمنہ اور شمس بازغہ کی گہرائی اور گیرائی میں جو تفاوت ہے، ظاہر ہے)۔

اگلی صدی میں محمد شاہ کے عہد حکومت میں راجہ جے سنگھ اور مرزا خیر اللہ مہندس کی سرکردگی میں ”رصد گاہ محمد شاہی“ قائم ہوئی جو اُس زمانہ میں یورپ کے اندر بھی اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی۔ غرض قرون وسطی کے اندر جسے بجا طور پر ”قرون مظلمہ“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، صرف ایک خطہ زمین ہی ایسا تھا، جو علم و حکمت کی روشنی سے جگمگ کر رہا تھا۔ یہ ”سراسینس“ (SARACENS) کا ملک تھا، جو اپنی علمی و حکمی سرگرمیوں کی بنا پر مشرقِ تاہاں اور مطلع الانوار بنا ہوا تھا، جہاں یورپی فضلا بھی آکر اپنے مسلمان اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے اور ان کی فیض رسانی سے مستفید ہوتے۔ بعد میں قرون وسطی کے انہیں یورپی فضلا کے ثقافتی ورثہ پر جدید یورپ نے اپنے تمدن کی فلک بوس عمارت قائم کی۔

(۲) اسلامی ثقافت کے عناصر

اسلامی ثقافت نام ہے ”عرب کے سوز دروں“ اور ”عجم کے حسنِ طبیعت“ کے متوازن امتزاج کا۔ (۱) عرب کا سوز دروں: اسلام کا آغاز ایسے ملک میں ہوا تھا جو کسی زمانہ میں شاید تہذیب و ثقافت کا علم بردار رہا ہو تو رہا ہو مگر بعثتِ اسلام کے قبیل تہذیب و حضارت سے زیادہ بدویت کی طرف مائل تھا۔ شاید اسی وجہ سے فردوسی نے طعنہ دیا تھا: —

ز شیر خور درون دوسو سار عرب را بجائے رسید است کار

کہ ملک عجم را کنند آرزو تفتو بر تو اے چرخ گرداں تفتو

فردوسی کا یہ طعنہ بہت کچھ قومی تعصب پر مبنی ہے۔ مگر خود مسلمان موزعین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ بعثتِ اسلام سے قبل عربوں میں کوئی قابلِ ذکر علمی و ثقافتی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ ابنِ خلدون نے صنعت و معرفت اور علم و حکمت کے اندر عربوں کی بے مانگی کی منطقیانہ توجیہ کے لئے اپنے مقدمہ میں ایک مستقل فصل قائم کی ہے، جس کا عنوان ہے:-

”فصل اس بارے میں کہ عرب ساری دنیا کے لوگوں میں صنعت و معرفت میں کمال حاصل کرنے سے دُور ہیں۔“

اسی طرح قاضی صاعد اندلسی نے ”طبقات الامم“ میں لکھا ہے:-

”ربا علم فلسفہ تو اللہ تعالیٰ نے اس سے واقفیت کی نعمت سے عربوں کو محروم کر رکھا ہے، اور اُن کے مزاج میں اس سے آشنائی کی صلاحیتیں ہی پیدا نہیں کیں۔“

لیکن اس تہذیبی پس ماندگی کے باوجود، اُن کے اس ”سوزدروں“ کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ نہایت ہی طویل عرصے میں وہ اپنی سچی پیہم سے دنیا کے علمی خزانوں کے وارث ہو گئے اور ان سب کے حصول کے بعد ایک نئی ثقافت کی تشکیل کی، جس نے تہذیبِ حاضر تک کو متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑا۔

(ب) عجم کا حسنِ طبیعت، عربوں کو یہ علمی ورثے عجمیوں سے ملے جو کسی زمانہ میں بڑی شاندار تہذیبوں کے علم بردار رہ چکے تھے، مگر امتدادِ زمانہ سے اُن کی عظمتِ دیرینہ بھولی بسری داستانِ بن بعلی تھی۔ یہ عربوں کا ”سوزدروں“ ہی تھا جس نے ”عجم کے حسنِ طبیعت“ کے گہرائے گراں مایہ کو گوشہٴ گم نامی سے نکالا۔

”عجم کے حسنِ طبیعت“ کے گہوارے جن سے ”عرب کے سوزدروں“ نے خوشہ چینی کی، بہت تھے۔ مگر عربِ عبقریت اپنی تشکیل کے لئے سب سے زیادہ ایران اور یونان کی رہیں منت ہے۔ ایک حد تک وہ ہندوستانی علم و حکمت سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ مگر یونانی حکمت کی عظمت و ثروت کے بیشِ نظر دوسری تہذیبوں کے اثراتِ اسلامی ثقافت میں ماند ہو کر رہ گئے۔ اس لئے خصوصیت کے ساتھ یونانی ثقافت کا تذکرہ ناگزیر ہے، کیوں کہ اسی کے بعد اسلامی ثقافت کو اُس کے صحیح پس منظر میں سمجھا جاسکتا ہے۔

(۴) یونانی شقاقت

تاریخ عہد قدیم دنیا کی بے شمار قوموں کے تہذیب و تمدن کی داستان ہے جس کی تشکیل میں ہر قوم نے حصہ لیا تھا۔ مگر بد قسمتی سے ان ثقافتی سرگرمیوں کی تفصیل تاریخی صحت کے ساتھ قلم بند کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس مبالغہ آرائی کر کے اسی تاریخ کو افسانہ بلکہ "اساطیر اولین" بنا دیا ہے۔ صرف یونان کی علمی و ثقافتی ماعی ضرور تاریخی طور پر مدون کی گئی ہیں اور چونکہ اسلامی علوم کی تشکیل و ترقی بڑی حد تک یونانی علم و حکمت ہی کی رہین احسان ہے۔ اس لئے اس پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا۔

۱۔ عہد قدیم کی عظمت: یونانی ثقافت فضلاء یونان کی ہزار سالہ علمی ماعی کا نام ہے۔ اس کی ابتداء تھالس الملطی (THALES OF MILETUS) جس کا زمانہ ۶۲۴ لغایت ۵۴۸ قبل مسیح ہے اور انتہا ۲۹۵ء میں جب کہ ایتھنز کا مدرسہ فلسفہ بند کر دیا گیا۔ اس طویل مدت میں یونانی عبقریت نے متعدد حکماء و فلاسفہ پیدا کئے جنہوں نے منطق و فلسفہ، ریاضی و جہت اور طب و دیگر طبیعیاتی علوم کو سائنسیک بنیادوں پر مدون کیا۔

اس عہد کی عظمت کے بارے میں مورخین رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ پروفیسر تھلی یونانی فلاسفہ کی فلسفیانہ ماعی کی عظمت و اہمیت کے بارے میں لکھتا ہے:-

”انہوں نے (یونانیوں نے) نہ صرف اُس چیز کا سنگ بنیاد رکھا جس پر بعد کی مغربی تفکر کے تمام نظاموں کی تعمیر ہوئی، بلکہ اُن تمام مسائل کی اور اُن کے جملہ ممکنہ جوابات کی تشکیل کی، جن کے ساتھ دو ہزار سال تک یورپی تہذیب نے خود کو مشغول رکھا ہے۔ ان کا فلسفہ سادہ اساطیری قیام آرائیوں سے لے کر پیچیدہ مگر جامع نظامہائے فکر تک ارتقار کی اُن بہترین مثالوں میں سے ہے۔ کسی قوم کے یہاں پایا جاسکتا ہے۔ حریت فکر اور سچائی کی محبت کے اُس جذبے سے جس نے اُن کے مفکرین کو گرمائے رکھا، بڑھ کر اور کوئی مثال دیکھنے میں نہیں آئی، بلکہ اُس حد تک بھی دوسری اقوام کی بہت کم رسائی ہوئی ہے۔“

اسی طرح یونانیوں کے بہت سی کمالات کے بارے میں سر جارج کارنوال لیوس نے لکھا ہے:-

”اگر قدامت (یونانی ہیئت داں) صرف خود رہن اور گھڑی سے واقف ہوتے تو اُن کے طریقے

تقریباً تمام عملی اغراض کے لئے کافی ہوتے، ہر چند کہ وہ ارض مرکزی مفروضہ ہی کے کیوں نہ قائل رہے اگر قدماء کے ہیئت علوم عہد حاضر کے مقابلے میں کمتر صحیح اور کمتر جامع تھے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے وہ انسانی معاملات کے ساتھ بڑا قریبی تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے تقریباً اُن تمام شعبوں کو اپنایا تھا، جو نبی نوع انسان کے لئے مفید ہیں۔

اسی طرح انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا ایک آرٹیکل نویس یونانی ہندسہ کے شاہکار (اصول اقلیدس) کے بارے میں لکھتا ہے:-

”علم ہندسہ کی اشکال کو اس تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کی پہلی جامع اور منظم کوشش جو ہم تک پہنچی ہے، تمام ادبی شاہکاروں میں بہترین تصنیفوں کے اندر محسوب ہونے کی مستحق ہے۔ ہماری مراد اقلیدس اسکندریہ کی اصول الہندستہ والحساب سے ہے۔ اس قدیم علمی شاہکار کے کم و بیش حریفی ترجمہ پچھلی نسل کے زمانہ تک انگلستان کے تمام پبلک اسکولوں میں درسی کتاب کی حیثیت سے متداول تھے۔ آج بھی تمام ممالک میں ہندسہ کی نصابی کتابیں اصول اقلیدس ہی کی ترتیب و تحسیر پر مبنی ہیں۔“

اس ہزار سالہ مدت کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے قبل سقراطی دور۔ یونانی فلسفہ کا عہد زریں (سقراط افلاطون اور ارسطو کا زمانہ)۔ بعد ارسطو طالسی دور (جو رواقیت، ایتھوریت اور ارتیا بیت نیز انتخابیت کی تحریکوں پر مشتمل ہے)، اور یونانی فلسفہ کا عہد آخر (جو نام ہے یونانی یہودی فلسفہ، نویشا خورت اور نو افلاطونیت کا)۔ (تفصیل غیر ضروری ہے)۔

۲۔ یونانی حکمت کا مثل اعظم۔ یونانی ثقافت کا واسطہ القعد اور حکمت یونانیان کا مثل اعظم ارسطو تھا، چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے ”طبقات الامم“ میں لکھا ہے:-

”اور ارسطو پر یونانیوں کا فلسفہ ختم ہو گیا۔ وہ اُن کے حکماء کا خاتم اور اُن کے علماء کا سردار ہے۔“

ارسطو سکندر کا ہم عصر تھا۔ جس سال سکندر نے وفات پائی، اُس کے اگلے سال اُس نے بھی انتقال کیا۔ مگر اُس کے شاگردوں نے اُس کی علمی روایات کو زندہ رکھا۔

سکندر کے انتقال پر اُس کی وسیع سلطنت اُس کے جرنیوں میں تقسیم ہو گئی۔ مصر بطلمیوی خاندان کے حصہ میں آیا۔ جس نے تقریباً تین سو سال تک حکومت کی۔ یہ لوگ اپنے ہمراہ یونانی علم و حکمت کو بھی

لائے تھے۔ اُن کے عہد حکومت میں اسکندریہ یونانی ثقافت اور یونانی علوم کا گہوارہ اور نیا سائنس و ادب کا مرکز بن گیا تھا۔ بطالمہ ہی نے اسکندریہ کی مشہور لائبریری قائم کی تھی۔ انہیں کے زمانہ میں ریاضی و ہیئت کے مشاہیر فنکار اقلیدس، اریستو، ارسطو، دیوفانس اور ایرن وغیرہ پیدا ہوئے، جن کا ریاضی و ہیئت کی تاریخ میں خاص مقام ہے۔ ان کے علاوہ شاگردان ارسطو کی ایک جماعت بھی اسکندریہ پہنچ گئی تھی، جہاں انہوں نے اسناد کی علمی روایات کو جاری رکھا۔

بطلمیوسی خاندان کی آخری تاجدار کلیوپٹرا تھی۔ جس کے زمانہ میں قیصر اوشطس نے حملہ کیا اور مصر کو فتح کر کے رومی سلطنت کا ایک صوبہ بنالیا۔ یہ سنہ ۳۰ ق م کا واقعہ ہے۔ اس زمانہ میں مدرسہ فلسفہ کا صدر اندرونیقوس تھا، جسے قیصر اپنے ہمراہ روم لے گیا۔ مگر وہ اپنا جانشین اسکندریہ میں چھوڑ گیا اور اس جانشین اور اس کے شاگردوں نے اپنے اساتذہ کی علمی و محی سرگرمیوں کو بعد میں برقرار رکھا۔ لیکن آخر زمانہ میں مسیحی تعصب کی وجہ سے یہ مدرسہ گوشہ گم نامی میں پڑ گیا۔ پھر بھی مخالفین کی آزار رسانیوں کے باوجود یہ ادارہ کسی نہ کسی طرح باقی رہا، تا آنکہ عربوں نے مصر کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد بھی یہ مدرسہ اسکندریہ میں چلتا رہا، مگر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں یہ اسکندریہ سے انطاکیہ میں منتقل ہو گیا۔

۳۔ یونانی ثقافت کی کبھی دلبستگی :- آخر کار امتداد زمانہ سے یونانی عبقریت کے سوتے خشک ہو گئے۔ تقلید و جمود کے علاوہ جو ہر ترقی پذیر تحریک کے خاتمہ کی علامت ہے، ان لوگوں میں اختراع و ایجاد اور عقلیت پسندی کے بجائے توہم پرستی اور تعصب و تنگ نظری پیدا ہو گئی۔
۱۔ توہم پرستی :- یونانی ثقافت کے آخری دور کے علم بردار نوافلاطونی تھے، جن کے بارے میں وہلم نیسل لکھتا ہے :-

”یہ فلسفی متعدد دیوتاؤں کی پرستش کے آخری حامی تھے۔ لیکن بیشتر نے ان کے ہاں فلسفیانہ توجیہ اختیار کر لی تھی۔“

نوافلاطونی مکتب فکر کا بانی فلاطینوس (PLATINUS) ہے۔ اس کے بارے میں پروفیسر تھیل لکھتا ہے :-

”فلاطینوس شرک و تکثیر کا انکار نہیں کرتا۔ دیوتا بھی الوہیت کے مظاہر ہیں۔ وہ عالم تحت القمر

میں اچھے اور بُرے جنات اور بھوت پریتوں کا قائل ہے۔

اُس کے متبعین کے بارے میں یہی فاضل پر و فیسر لکھتا ہے:-

”اُس کے بہت سے متبعین نے ان توہمات میں بے حد مبالغہ کیا، عوامی شرک و تکثیر کی حمایت

کی، عیسائی مذہب پر حملے کئے اور جادو اور خرافات میں انہماک اختیار کیا۔“

اس توہم پرستی کا سب سے بڑا نو فلاطونی علم بردار ایامیلیس تھا جس کے بارے میں ولیم نیلس

لکھتا ہے:-

”ایامیلیس کے یہاں فوق الارضی دیوتاؤں کے علاوہ ارضی دیوتا بھی ہیں..... ان کے بعد

جنات ملائکہ اور ابطل آتے ہیں۔ قومی دیوتاؤں کو بھی وہ اس دہمی نظام میں جگہ دیتا ہے۔ بتوں کی

پوجا، جھاڑ پھونک، جادو، پیشین گوئی وغیرہ کی بھی وہ اسی قسم کی توجیہ کرتا ہے۔“

اسی طرح پر و فیسر تھلی لکھتا ہے:-

”اس کے نظام معتقدات میں توہم پرستی فر فریوس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہم کردار انجام

دیتی ہے۔“

ب:- عام طور پر فلاسفہ بڑے روشن خیال اور وسیع المشرب سمجھے جاتے ہیں۔ مگر ان متاخر

یونانی فلاسفہ نے تومیسیت آزاری کی حد کر دی۔ اس کی تفصیل یہ ہے:-

جس زمانہ میں رومیوں نے مصر کو فتح کیا، اُس کے کچھ ہی عرصہ بعد مسیحیت کا ظہور ہوا۔ (نیرود ۵۴۸-

۶۴۸ء) کے عہد میں وہ مصر کے اندر داخل ہوئی اور جلد ہی مقبول ہونے لگی۔ مگر اپنی روز افزوں مقبولیت

اور بادشاہ پرستی سے انکار کی بنا پر سلطنت کے لئے خطرہ سمجھی جانے لگی۔ بنابرین عیسائیوں پر جو رد

تقدی کا آغاز ہوا۔ اُن کی مذہبی آزادی چھین لی گئی اور وہ ترک مذہب کے لئے مجبور کئے گئے۔

اس جو رد تقدی کے دوران میں فلاسفہ نے بھی مسیحی مذہب کو ہدفِ مطاعن بنایا۔ پہلے ذاتیوں

نے عیسائی مذہب پر اعتراضات کئے۔ بعد میں نو فلاطونی فلاسفہ نے اس ادچھے ہتھیار کو آزمایا۔

ان نو فلاطونی فلاسفہ میں فر فریوس خاص طور سے مشہور ہے، ویسے تو دانش و حکمت میں وہ

ارسطو کے نو فلاطونی متبعین میں خاص مقام رکھتا ہے۔ مگر مذہبی معاملات میں وہ بڑا تنگ نظر تھا۔

چنانچہ ولیم نیلس اُس کی توہم پرستی کے ساتھ اُس کی تنگ نظری کا بھی شاکی ہے:-

”عیسائیوں کے خلاف پندرہ دفتروں میں وہ اپنے قومی مذہب کی حمایت کرتا ہے اور اس بارے میں جنات کی نسبت تمام مروجہ توہمات سے مدد دیتا ہے..... خونریز قربانیاں وغیرہ ایسی چیزیں جن کو فی نفسہ بُرا سمجھتا ہے، اُن کو عبادت عامہ میں خلیفہ ریحوں کو شکست دینے کے لئے جائز قرار دیتا ہے۔“

۴۔ یونانی ثقافت کا خاتمہ ۱۔ ظاہر ہے کوئی تہذیب تو ہم پرستی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ کوئی اجتماعی نظام تعصب و تنگ نظری اور زیر دست آزاری کے ساتھ زیادہ عرصہ تک برقرار رہ سکتا ہے۔ اس لئے یونانی ثقافت (جس کے بچانے کی یہ نوظلاطونی حکما، گوشش کر رہے تھے) کا خاتمہ بھی فطری تھا۔ چنانچہ پرمیسر تھلی لکھتا ہے ۱۔

”لیکن اب اس فلسفہ میں کوئی جان نہیں رہ گئی تھی۔ قدیم شرک و بخیر میں جان ڈالنے اور پرانی تہذیب کے بچانے کے سلسلے میں اس کی ساری کوششیں بے سود تھیں۔ یہ فلسفہ اپنی انادیت کے دن ختم کر چکا تھا۔“

چنانچہ ۵۲۹ء میں قیصر جینیان نے ایٹھنر کے مدرسہ فلسفہ میں قفل ڈال دیا اور فلاسفہ کو جلاوطن کر دیا۔ چنانچہ دیبر لکھتا ہے ۱۔

”۵۲۹ء میں شرک پسند نوظلاطونیت کی آخری جائے پناہ یعنی ایٹھنر کا مدرسہ فلسفہ جہاں برقلس نے تعلیم دی تھی، شاہنشاہ جینیان کے حکم سے بند کر دیا گیا۔“

لیکن یونانی ثقافت کی ناکارگی کا احساس اتنا عام ہو چکا تھا کہ تاریخ کے اتنے اہم واقعہ کو بھی کسی نے درخور اعتناء سمجھا۔ دیبر آگے چل کر لکھتا ہے ۱۔

”عہد ماضی کے اس منہدم آثار سے عوام اس درجہ بے پروا تھے کہ شاید ہی کسی نے اس شاہی اعلان کی طرف توجہ دی ہو۔“

۵۔ اساقفہ کا تعصب اور ثقافت بیناری ۱۔ یونانی ثقافت کے خاتمہ کی اصل وجہ اُس کی ذاتی کمزوری تھی۔ اب یہ بدلے ہوئے زمانہ کا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔ ترقی پذیری کے تمام رجحانات ختم ہو چکے تھے۔ مگر اس ذاتی کمزوری کے علاوہ ایک خارجی موثر بھی اس کی بربادی میں کار فرما تھا۔ یہ پادریوں کا تعصب اور اُن کا ثقافت بینار جذبہ تھا۔ مزید تفصیل حسب ذیل ہے ۱۔

عرصہ تک مسیحی لوگ رومن امپائر میں معتبوب رہے۔ مگر آخر کار ۳۲۳ء میں قسطنطین اعظم تخت

نشین ہوا جس نے کچھ دن بعد عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اب مسیحیت رومن امپائر کا ملکتی مذہب قرار پائی۔ لیکن سیاسی اقتدار ملتے ہی یہ مظلوم اور ستم رسیدہ مسیحیت ظالم و ستم کار بن گئی۔ رومن امپائر کی اگلی دو سو سال کی تاریخ مذہبی تشدد و تنگ نظری اور فرقہ وارانہ کش مکش کی مسلسل داستان ہے۔

قیصر ثاؤڈوسیوس (THEODOSIUS زمانہ ۳۷۹-۴۵۶ء) کے تحت نشین ہونے پر رومی مملکت کے تمام باشندوں کو بائبل پر عیسائی بنانے کی کارروائی پر سختی سے عمل کیا گیا۔ پادریوں نے بلا کسی استثناء کے تمام مندروں کو برباد کرنا شروع کیا۔ مگر سرافیس کے مندر کے معاملہ میں بڑھ ہو گیا۔ بڑی خونریزی کے بعد عیسائیوں نے اسے منہدم کر کے گر جانا لیا۔ اس مذہبی جنون کا فسوس ناک پہلو یہ تھا کہ سرافیسوں کی لائبریری جو بطلیمیوس فلاڈلفیوس کی لائبریری دکتب خانہ اسکندریہ کے جل جانے پر اس کی جگہ قائم ہوئی تھی ۳۹۱ء میں اس تعصب و تنگ نظری کا شکار ہو گئی۔ اور اس کے بعد کرفیٹن ملٹی کے نقلوں میں:-

”چوتھی صدی میں شہر اسکندریہ کے اندر کسی لائبریری کا وجود نہیں ملتا اور یہ فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کسی مذہبی یا ملکی حاکم نے کسی کتب خانہ کی نگہداشت کی زحمت گوارا کی ہو۔“

ثاؤڈوسیوس کے آخر عہد حکومت میں سائرل مصر کا اسقف اعظم بنا۔ اس نے مدارس فلسفہ کو بھی اپنے تعصب و تنگ نظری کا نشانہ بنایا، کیوں کہ اس کے خیال میں یہی مدارس جاہلیت و وحشت کے مرکز تھے۔ اس کے اشارے سے فلاسفہ پر حملہ ہوا۔ اس تعصب و تنگ نظری کا تاریک ترین پہلو عقیدہ فہیم ہائی پیشیہ (HYPATIA) کا مدناک قتل تھا جو اسکندریہ کی نو فلاطونی جماعت کی صدر تھی۔ تاریخ عبر انسانی کا یہ گھناؤنا سانحہ ۴۱۵ء میں پیش آیا۔

پادریوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ انہوں نے علم و حکمت کی ترقی کو بھی قانوناً بند کر دیا۔ اس سلسلہ میں ان کی تنگ نظری کا شدید ترین حملہ منطق پر ہوا۔ چنانچہ ابن ابی اصبغہ نے فارابی سے نقل کیا ہے:-

”اسی طرح سے کام چلتا رہا۔ یہاں تک کہ مسیحیت کا زمانہ آیا تو فلسفہ کی تعلیم روم سے ختم کر دی گئی اور صرف اسکندریہ میں باقی رہ گئی۔ پھر نصرانی بادشاہ نے فلسفہ کی تعلیم پر غور کیا۔ پادری لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے باہم اس امر میں مشورہ کیا کہ فلسفہ کی کتنی تعلیم باقی رکھی جائے اور کتنی بند کر

دی جائے۔ اس پر یہ رائے ہوئی کہ منطق کی کتابوں میں سے اشکال وجودیہ تک کی تعلیم دی جائے، اور اس کے بعد کی تعلیم نہ دی جائے، کیوں کہ اس سے نصرانی مذہب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، اور جتنے حصہ کی تعلیم باقی رکھی گئی تھی، اُس سے اُن کے مذہب کی تائید میں مدد مل سکتی تھی۔ پس منطق کی اتنی ہی تعلیم کا رواج رہا، اور باقی غیر مروج ہو گئی۔

نارباہی کی اس روایت کی تصدیق رینان اور اسٹینشنڈرنے بھی کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ارسطاطالیسی منطق کے سرِ بانی تراجم ہمیشہ "انالوطبقائے اولیٰ" (ANALYTICAE PRIOR) کی ساتویں فصل پر ختم ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہمت شکن حالات میں مدارس فلسفہ کا باقی رہنا تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ ماکس مایر ہون (MAX MEIRHOE) لکھتا ہے:-

”اس زمانہ میں کسی عام فلسفی مدرسہ کا وجود فرض کرنا بھی مشکل ہے، کیوں کہ اس وقت سے مذہبی تعصب بڑھتا گیا اور اس نے دشمنی محبتیں و تلامذہ کے لئے زندگی دشوار کر دی۔“

پھر بھی اسکندریہ کا مدرسہ فلسفہ جس کا صدر ظہور مسیحیت کے قریبی زمانہ میں اندرونِ مقوس تھا، کسی نہ کسی طرح باقی رہا (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے)۔

(۵) قرونِ وسطیٰ اور مسیحی مغرب کی تہذیبی لپس ماندگی

۵۲۹ء میں ایتھنز کا مدرسہ فلسفہ بالجبر بند کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ثقافتی تاریخ کا عہد قدیم ختم ہوا۔ اسی کے بعد قرونِ وسطیٰ کا آغاز ہوا۔ قرونِ وسطیٰ کو تاریخ میں ”قرونِ مظلمہ“ (DARK AGES) کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اگر اسلام کی ثقافتی سرگرمیوں سے صرف نظر کر لیا جائے تو اس دور کے لئے یہ بالکل ہی مناسب نام ہے۔ اس لئے فضلاء اسلام کی ثقافتی ساعی کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُن کے ہم عصر یورپی فضلاء کی کادشوں کا ایک اجمالی تذکرہ نظر کے سامنے رکھا جائے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کو ”قرونِ مظلمہ“ (DARK AGES) بھی کہا جاتا ہے اور اگر اُن ساعی سے صرف نظر کر لیا جائے جو اس زمانہ میں اسلامی ممالک کے اندر ظہور پذیر ہوئیں تو یورپی تاریخ کے اس دور کے واسطے یہ بالکل موزوں نام ہے۔ چنانچہ ڈی ولف نے اس عہد کے بارے میں ایک مؤرخ کا یہ قول نقل کیا ہے:-

”۱۲۹ء سے لے کر جس سال قیصر جینیان نے یونانی مدارس کو بند کر دیا تھا، ۱۶۳۷ء تک جس سال ڈیکارٹ کی مقالات برمناج شائع ہوئی، نیند کی ماتی انسانیت نے غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیا تھا، یا یوں کہیے کہ علم و حکمت کے اہم مسائل کو نظر و رویت کے حضور میں لانا ہی بند کر دیا تھا۔“

قرن وسطیٰ کی ابتدائی صدیوں کی ناکارگی کے بارے میں مورخ فلسفہ پروفیسر تھل لکھتا ہے:-
 ”ساتویں اور آٹھویں صدی غالباً ہماری مغربی یورپی تہذیب کا تاریک ترین دور ہیں جو لامحدود جہالت اور وحشت و بربریت کا عہد ہے۔ اس جہالت و بربریت کے دور میں کلاسیکی عہد ماضی کے ادبی اور فنی کارنامہ کمالات بالکل فراموش ہو گئے۔“

یہ مغربی یورپ کی ثقافتی حالت پر تبصرہ ہے۔ مگر مشرقی یورپ کی حالت بھی کچھ زیادہ بہتر نہ تھی، چنانچہ ڈی ولف آخری یونانی حکماء کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:-

”دو فلاطونیت کے آخری نمائندوں تاسطیوس اور برقلس کی باز لطینی قلمرو میں آمد و رفت تھی۔ مگر ان کے بعد ہیں آٹھویں صدی سے قبل کوئی قابل ذکر نام نہیں ملتا۔“

اور آٹھویں صدی کا یہ ”قابل ذکر فاضل“ ولف کی تصریح کے مطابق یوحنا دے دمشق ہے جو تاریخ سے زیادہ افسانہ کا ہیرو بننے کا مستحق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ باز لطینی حکمران اپنی سعی و کوشش کے باوجود ملک کو ثقافتی جمود و غفلت سے بیدار کرنے میں ناکام رہے تھے۔ چنانچہ ولف دوسری جگہ لکھتا ہے:-
 ”مشرق کے مسیحی بادشاہ نے متعدد بار قسطنطنیہ میں فلسفہ کا ایک مستقل مدرسہ جاری کرنے کی اور اس طرح نئے دارالسلطنت کو ایتھنز اور اسکندریہ کا حریف بنانے کی کوشش کی.....“

۱۱۸ء میں شاہنشاہ ہرقل نے اسکندریہ کے ایک اُستاد کو اس امید میں قسطنطنیہ بلایا کہ شاید اُس کی تعلیم باز لطینی عبقریت کو اُس کے جمود و غفلت سے بیدار کر دے۔ لیکن یہ سعی، سعی ناکام ہی ثابت ہوئی۔ صرف مستقبل بعید ہی کی نسلوں کو اس بیداری کو دیکھنا لکھا تھا۔“

گورٹ جو بعد میں سوسٹر دوم کے نام سے پوپ کے عہدہ پر فائز ہوا، اُس نے بشپ آف اورلینز کے لئے جو تقریر مرتب کی تھی، اُس میں لکھا تھا:-

”یہ بات قابل غور ہے کہ روم کے اندر ایک شخص بھی آنا پڑھا لکھا نہیں ہے کہ وہ دربان کے کام پر مقرر کئے جانے کا اہل ہو۔ جس شخص نے خود کچھ تعلیم نہ پائی ہو، وہ کس منہ سے تعلیم کے

فرائض انجام دے سکتا ہے۔“

یہ دسویں صدی مسیحی کی کیفیت ہے۔ بعد کی تین صدیوں اور ان کے بعد کے زمانے کے متعلق دلائل میں وغیرہ مورخین کے اقوال نقل کرتا ہے:-

”تین کا خیال ہے کہ تیرھویں صدی کے فحول فضلا دیورپ کا زمانہ محض ناکارہ لوگوں کا زمانہ ہے جو نفرت و حقارت کے سوا کسی اور بات کا مستحق ہی نہیں۔ اس تاریک عرصہ کی تہہ میں جو تین صدیاں گزری ہیں، انہوں نے انسان کے عقلی درجہ میں ایک نئے تصور کا بھی اضافہ نہیں کیا۔ دوسرے لوگوں کی رائے ہے کہ قرون وسطیٰ کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے۔ یہ لوگ اس زمانہ کو انسانیت کے لئے موجب ننگ و عار سمجھتے ہیں۔“

(۶) تصویر کا دوسرا رخ۔ اسلامی مشرق کی درخشانی

۱۔ قرون وسطیٰ کی یورپی اور اسلامی ثقافت کا تقابل: قرون وسطیٰ کی ظلمت و تاریکی میں جبکہ یورپ جہالت و پس ماندگی کا تیرہ مغاک بنا ہوا تھا، ربح سکون کا ایک حصہ ایسا بھی تھا جو علم و حکمت کی روشنی سے جگمگ کر رہا تھا۔ چنانچہ ڈریسپر مسیحی یورپ اور قلمرو اسلام کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”یورپ کے قدیم باشندوں کی بربریت کے ذکر کے بعد اندلس کی اسلامی تہذیب کا تذکرہ کس قدر خوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ یورپ کے ان قدیم باشندوں کے بارے میں مشکل ہی سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بربریت و وحشت کی منزل سے آگے ترقی کر چکے تھے۔ ان کے بدن گندے تھے، دماغ توہمات سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ لوگ مزاروں کی کرامات اور ادا عالی تبرکات کے متعلق ہر قسم کے بے سرو پا افسانوں میں اعتقاد کامل رکھتے تھے اس کے مقابلہ میں اندلس کی اسلامی تہذیب کس قدر خوش آئند معلوم ہوتی ہے! جب کہ ہم یورپ کے جنوب مغربی گوشہ اسپین پر نظر ڈالتے ہیں، جہاں بالکل ہی مختلف حالات کے تحت علم و حکمت کے انوار تاباں کی روشنی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ مغرب میں ہلال (اسلامی تہذیب) بدر کامل بن کر مشرق (وسطی یورپ) کی طرف جانے والا تھا۔“

یہی مصنف اندلس کے حکمران طبقہ کی علمی سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”جو نحیں عربوں کو اسپین میں مضبوطی سے قدم جما نے کا موقع ملا، وہیں انہوں نے ایک روشن دور کا آغاز کیا..... قرطبہ کے امیروں نے خود کو علم و ادب کا سرپرست بنا کر متاز کر لیا اور ذوق سلیم کی ایک ایسی مثال قائم کر دی جو یورپ کے دیسی شہزادوں کی حالت کا بالکل عکس تھی۔“

اس کے بعد وہ ان علمی سرپرستیوں کا ایک اجمالی تذکرہ بیان کرتا ہے:-

”انہوں نے تمام بڑے بڑے شہروں میں لائبریریاں قائم کیں۔ کہا جاتا ہے کہ ستر سے زیادہ لائبریریاں اُس زمانہ میں موجود تھیں۔ ہر مسجد کے ساتھ ایک عوامی مکتب ہوتا تھا، جہاں غریبوں کے بچوں کو نوشت و خواند اور قرآن مجید کی تعلیم دی جاتی تھی۔ صاحب استطاعت لوگوں کے لئے علمی جامع (اعلیٰ مدارس) تھے جہاں ایک بڑا عالم صمد ہوتا تھا۔ قرطبہ، غرناطہ اور دوسرے بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں تھیں۔ ان یونیورسٹیوں میں بعض پروفیسر ریاضی و ہیئت کی تعلیم دیتے تھے..... ان کے علاوہ مخصوص فنون کے واسطے خصوصی مدارس تھے، بالخصوص طب کے لئے۔“

ایک اور ناצל کارادی ”اپنے متکلمہ ”ریاضی و ہیئت“ میں جو اُس نے ”لیگیسی آف اسلام“ مرتبہ آرنڈ کے واسطے لکھا تھا، رقمطراز ہے:-

”عربوں (مسلمانوں) نے اُس زمانہ میں اعلیٰ تعلیم اور علم و حکمت کے مطالعہ کو زندہ رکھا، جب کہ مسیحی مغرب (یورپ) بربریت کے ساتھ جان توڑ لڑائی کر رہا تھا۔ اُن کی علمی سرگرمیوں کا عہد نویں دسویں صدی میں متعین کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اُن کی یہ سرگرمیاں پندرہویں صدی تک جاری رہیں۔ بارہویں صدی کے بعد ہر شخص جسے علم و حکمت کا ذرا سا بھی شوق ہوتا یا نورِ علم کی تھوڑی سی بھی خواہش ہوتی تو وہ یا مشرق (بغداد) کا سفر کرتا یا اسپین کا۔“

لیکن ڈیربر کہتا ہے کہ تحصیل علم کے لئے اسپین کا سفر شائقین علم نے دسویں صدی مسیحی ہی سے شروع کر دیا تھا۔

”دسویں صدی مسیحی ہی سے جن لوگوں کو حصول علم کا شوق ہوتا، یا تہذیب و ثقافت کا ذوق رکھتے، وہ ہمایہ ممالک سے اسپین پہنچتے اور بعد کے زمانہ میں تو اس دسم پر لوگوں کا عمل بہت زیادہ بڑھ گیا، بالخصوص جب کہ گرہٹ نے اپنی غیر معمولی ترقی سے ایک شاندار مثال قائم کر دی۔ کیوں کہ وہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرطبہ کی اسلامی یونیورسٹی ہی سے پڑھنے کے بعد یورپ کے عہدہ پر فائز ہوا تھا۔“

مگر قرون وسطی کے یورپی فضلا میں گورٹ (پوپ سلوس دوم) ایسا شخص نہیں ہے، جس نے اسلامی اسپین کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہو۔ قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیاں یورپی فضلا سے بھری رہتی تھیں اور یہیں سے فارغ ہو کر وہ مغربی تہذیب و ثقافت کے شمع بردار بننے کے لئے تیار ہو کر نکلتے تھے۔ ڈیوید سیری جگہ لکھتا ہے:-

”اسپین کی یونیورسٹیاں اقطاع یورپ کے علمائے دنیات سے بھری رہتی تھیں۔ پیٹری دی دینز بل جو ایلارڈ کا دوست اور مرتبی تھا، جس نے قرطبہ میں کافی وقت گزارا تھا اور جو نہ صرف روانی سے عربی بول سکتا تھا، بلکہ جس نے قرآن کریم کا لاطینی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا، بیان کرتا ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ اسپین پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ یورپ حتیٰ کہ انگلستان کے بہت سے تعلیم یافتہ اشخاص دیاں ہیئت کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔“

لیکن اسپین سے زیادہ علم و حکمت کا چرچا عراق و ایران میں تھا، جس کا تذکرہ ایک مستقل پیش کش کا مقتضی ہے۔

۲۔ عبارۃ اسلام:- اسلامی عبقریت نے بے شمار فضلا پیدا کئے، جن میں سے بعض مشاہیر کے نام حسب ذیل ہیں:-

۱۔ منطق و فلسفہ: ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی، ابو العباس احمد بن الطیب السرخسی، ابو زید احمد بن سہیل البیہقی، ابو نصر الفارابی، ابو الحسن العامری، شیخ بوعلی سینا، بہمن یار، ابو العباس اللوکرہی، عمر الخیام، ابو البرکات بغدادی، ابن باجر، ابن طفیل، ابن رشد، شہاب الدین سہروردی، مقتول، امام فخر الدین رازی، محقق نصیر الدین طوسی، علامہ قطب الدین شیرازی، سراج الدین رمی، افضل الدین خوجی، اشیر الدین ابہری، نجم الدین کاتبی، شمس الدین خسروشاهی، سیف الدین آمدی، میر سید شریف جرجانی، محقق دوانی، مرزا جان شیرازی، میر باقر داماد، ملا صدق الدین شیرازی، ملا محمود جوہوری، میرزا ہرودی، ملا محب اللہ بہاری۔

ب۔ طب: علی بن ابن الطبری، ابو بکر محمد بن زکریا الرازی، علی بن العباس المجوسی، ابو منصور قمری، شیخ بوعلی سینا، ابن رضوان مصری، ابو القاسم زہرادی ابن زہر، علی بن علی الکمال ابن انیس۔

ج۔ ریاضی و ہندسہ: محمد بن موسیٰ الخوارزمی، عباس بن سعید الجوہری، سند بن علی، بنو موسیٰ،

علی بن عیسیٰ المامنی، ابو العباس فضل بن حاتم النیریزی، ابراہیم بن سنان، ابو کامل شجاع بن اسلم، ابو جعفر الخازن، ابو الوفاء البوزجانی، ابو سہیل دیکن بن رستم الکوی، ابو نصر بن عراق، ابن الہیثم، ابو الجود، ابو بکر الکرخی، الاستاذ المختص ابو الحسن علی بن احمد السنوی، عمر خیام، ابو الفتح محمود اصفہانی، محقق طوسی، شمس الدین سمرقندی۔

د۔ ہیئت: محمد بن ابراہیم الفزاری، یعقوب بن طارق، محمد بن موسیٰ الخوارزمی، یحییٰ بن ابی منصور، خالد بن عبد الملک المروزی، عباس بن سعید الجوری، سند بن علی، الکندی، جیش الحاسب، ابو معشر البلیخی، ابو حلیفہ الدیوری، جابر بن سنان البتانی، ابو العباس فضل بن حاتم النیریزی، سیام بن عصمہ، عبد الغریز البہاشی، ابو جعفر الخازن، ابن العلم، کوشیا ابن لبان، احمد بن عبد الجلیل السجری، عبد الرحمن العلونی، ابو سہیل دیکن بن رستم الکوی، ابو الوفاء البوزجانی، ابو حامد الصغانی، ابو محمود الخجندی، ابو الحسن علی بن احمد السنوی، ابو نصر بن عراق، ابوریحان البیرونی، محمد بن احمد المومنی، عمر الخیامی، ابو الفتح عبد الرحمن الخازن، ابن یونس (صاحب الرزج المحکم)، ابن الصفا، ابن اسحج البرقیال، بہاء الدین ابو محمد الخرقی، محقق طوسی، قطب الدین شیرازی، محی الدین مغربی، محمود بن عمر بختیانی، ابغ بیگ، غیاث الدین کاشی، قاضی زادہ رودی، مولانا علاء الدین قوشچی، میرم چلی، امام الدین ریاضی، مرزا خیر اللہ مہندس۔

۴۔ جغرافیہ: ابن خرداذبہ، ابن داؤد یعقوبی، ابو الحسن السعودی، ابن رستہ، البیہانی، ابن الفقیہ ابن حوقل، المقدسی، ابن حاتم البہدانی، الادریسی، ابو الفداء، البکری، یاقوت، حمد اللہ مستوفی۔

و۔ تاریخ: ابن اسحاق، ابن ہشام، الواقدی، ابن سعد، مدائنی، الکلبی، البلاذری، ابو الحسن المسعودی، ابن قتیبہ، ابن جریر الطبری، ابوریحان البیرونی، ابن سکویہ، ابن الاثیر، ابو الفداء، ابن خلدون، عطارد ملک جوینی، حمد اللہ مستوفی، رشید الدین فضل اللہ، ابن الندیم، قاضی صاعد اندلسی، شہرستانی، ابن القفطی، ابن ابی اصیبعہ، ابو الحسن البیہقی، منہاج سراج، ضیاء الدین برنی، ابو الفضل، عبدالقادر بدایونی، فرشتہ وغیرہم۔ یہ تودہ فضلہ ہیں جو صرف دنیوی علوم میں اپنے وقت کے باکمال تھے۔ رہے علمائے دینیات تو ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے علمی کمالات: لیکن یہ حضرات محض عالم ہی نہیں تھے، بلکہ صاحب اتیکار و مکر بھی تھے جن

کی جدت ترویج اور ابتکار کرنے علم و حکمت کی ثروت میں بیش بہا اضافے کئے۔ ذیل میں نمونہ صرف ریاضی و ہیئت میں اُن کی عبقریت کے متعلق مبصرینِ یورپ کے تبصرے درج کئے جاتے ہیں۔ والفضلہ مایشہد بہ الاعداد..... کاراوی دو لکھتا ہے:-

”عربوں (مسلمانوں) نے سائنس میں واقعی بڑے کمالات حاصل کئے۔ انہوں نے صفر کا استعمال (علم الحساب یا ترقیم اعداد کا طریقہ) سکھایا، اگرچہ انہوں نے اسے ایجاد نہیں کیا تھا اور اس طرح وہ روزانہ زندگی کے علم الحساب کے بانی بن گئے۔ انہوں نے علم الجبر و المقابله کو ایک تحقیقی علم بنادیا اور اسے بہت زیادہ ترقی دی۔ انہوں نے تحلیل ہندسہ کی بنیاد ڈالی۔ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ علم الثنثات (مقیوہ اور علم الثنثات) الکوہیہ کے بانی تھے جو صحیح بات تو یہ ہے کہ اُن کے زمانہ سے پہلے وجود ہی میں نہیں آئے تھے، علم الہیئت میں انہوں نے قیمتی مشاہدات کئے۔“

اسی طرح مشہور مورخ ریاضیات کبجوری نے ”تاریخ ریاضیات“ میں لکھا ہے:-

”پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ عربوں نے ریاضیات میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ لیکن حالیہ تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ انہیں ان ابتکارات کا شرف ملنا چاہیے جو اس سے پہلے بعد کے لوگوں (اہلِ یورپ) کی دریافت سمجھے جاتے تھے۔“

کبجوری دوسری جگہ لکھتا ہے:-

”مہم عربوں میں ایک قابلِ تعریف علمی سرگرمی پاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے انہیں ایسے فرمانروا ملے تھے، جنہوں نے اپنی جود و سخا سے علمی تحقیقات کی ترقی میں بڑی مدد دی۔ خلفاء کے دربار میں اہلِ علم کے لئے کتب خانوں اور رصد گاہوں کا انتظام تھا۔ عرب مصنفین نے ہیئت اور ریاضی میں بجزرت کتابیں تصنیف کیں۔“

اس کے بعد اُس نے اُن پر فقدانِ عبقریت کے الزام کی تردید کی ہے:-

”کہا گیا ہے کہ عرب عالم تھے مگر عبقری نہیں تھے۔ لیکن اُن کی تصنیفات کے جدید مطالعہ سے ہم مجبور ہیں کہ اس رائے پر نظر ثانی کریں۔ انہیں بہت سے اہم کمالات کا شرف حاصل ہے۔ انہوں نے درجہ سوم کی مساواتوں کو ہندسی طور پر حل کیا۔ علم الثنثات کو نمایاں درجہ تک مکمل کیا اور ریاضی، طبیعیات اور علم الہیئت میں بجزرت کمتر اہم اضافے کئے۔“

خصوصیت کے اُس نے اُن کی الجبرا کی دریافتوں کے بارے میں لکھا ہے۔

”عرب درجہ دوم کی مساواتوں کے ہندسی حل سے واقف تھے۔ اب تیسرے درجہ کی مساواتوں کو ہندسی طور پر حل کرنے کی کوشش کی گئی..... مخروطات کے تقاطع کی مدد سے درجہ سوم کی مساواتوں کا حل علم الجبر والمقابلہ کی ترقی میں عربوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے..... لیکن مغرب (یورپ) میں عربوں کا تیسرے درجہ کی مساواتوں کا حل قریبی زمانہ تک غیر معلوم تھا۔“

اسی طرح اُس نے اُن کی ہیتی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا ہے:-

”ہیتی جداول (زوجیں) اور آلاتِ رصدیہ مکمل کئے گئے۔ رصد خانے تعمیر کئے گئے اور مسلسل مشاہدات فلکی کے قلم بند کرنے کا انتظام کیا گیا۔“

طب کے اندر چھ صدیوں تک شیخ بوعلی سینا کی ”کتاب القانون“ یورپی یونیورسٹیوں کے اندر نصاب میں داخل رہی۔ اس سے پہلے علی بن العباس المجوسی کی ”کامل الصناء“ کا رواج تھا۔ ان کے علاوہ ابو بکر بن زکریا الرازی کی بہت سی طبی تصانیف وہاں مروج تھیں۔

عرض یورپ جو آج علم و حکمت کی روشنی سے پر توستان بنا ہوا ہے، عرصہ تک مسلمانوں ہی کا خوشہ چیں رہا۔ پروفیسر تھلی لکھتا ہے:-

”مغربی یورپ عربی متون کے تراجم نیز عرب فلاسفہ کے نظامہائے فکر اور اُن کی شروح کے ذریعے سب سے پہلے ارسطاطالیسی نگارشوں سے واقف ہوا۔“

دوسری جگہ لکھتا ہے:-

”در ریاضیات، علم الہیت اور طب میں یونانیوں کے شاہکار..... ارسطو اور اس کے بعض یونانی شراح کی تصانیف..... اور مشاہیر عرب اور یہودی فلاسفہ اور ارسطو کے شارحین (کی کتابیں) اُن لاطینی تراجم کے ذریعے متعارف ہو رہی تھیں، جو عربی متون سے کئے گئے تھے۔“

یہ ہے اسلامی ثقافت کا تاب ناک ماضی جس پر اُس کے متبعین کی پس ماندگی کے پیش نظر مشکل ہی سے یقین آئے گا۔ مگر آنا چاہیے، کیوں کہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے معاندین کی مخالفانہ سرگرمیاں بھی جھٹلا نہیں سکتیں۔

کیا تاریخ کا ایک ایسا درخشاں دور اس بات کا مستحق نہیں ہے کہ اس کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور اس کے اُن گوشوں کو جو اس درخشاں دور کے نام یواؤں کی غفلت و جہود سے ادھیل ہو چکے ہیں، تحقیقی سرگرمیوں کا موضوع بنایا جائے؟

مید، ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب نہ صرف مسلمانوں ہی کو دینا ہے، بلکہ تاریخ تہذیب انسانی کے ماہرین بھی اُس کے لئے مکلف ہیں !! —

کتاب دعائم الاسلام

اُن محترم نے صدق جدید مورخہ ۲ جون ۱۹۶۶ء میں ناظرین کے مذہب پر جو تبصرہ ہے وہ بھی مناسب ہے۔ ہندوستان میں بوہرہ قوم کا یہ مذہب ہے۔ اور ان کے مذہب کی مستند کتاب دعائم الاسلام عربی میں ہے..... میرے ایک بوہرہ ملاقاتی نے کہا کہ آپ چونکہ متعصب نہیں اس لئے میں آپ کو اپنے مذہب کی کتاب جس کا نام دعائم الاسلام ہے، دیکھنے کو دیتا ہوں۔ چنانچہ دعائم دو جلدیں قلمی لکھی ہوئی مجھے دیں..... چنانچہ میرے ایک دوست نے ان کو پڑھ کر اس کے معنی بتلائے۔ پوری دونوں کتابوں کا مضمون تو یاد نہیں رہا۔ البتہ بعض ضروری باتیں یاد رہ گئیں۔ ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے نبی الاسلام علی سبعتہ دعائم۔ ہمارے یہاں علی خمس ہے۔ دعائم میں چھٹی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کا اقرار داخل ایمان ہے۔ ساتویں بات جہاد کی فرضیت کا اقرار بھی داخل ایمان ہے۔ دعائم میں لکھا ہے کہ ایمان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ خدا..... لغت کرے وہ کہتا ہے کہ جب تک تاسے نہ نکل آئیں اور خوب لہجہ راز ہو جائے روزہ مت افطار دے۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جب تک لوگ افطار میں جلدی اور سحر میں زیر کریں گے ان میں خیر و برکت ہے گی۔ ایک اور جگہ دعائم میں لکھا ہے کہ من تمت فطر زنی یعنی جس نے متعہ کیا اس نے زنا کیا۔ تمام دعائم میں کسی پر بھی لغت طاعت نہیں ہے، البتہ جناب علیؑ کی فضیلت کے بارے میں لکھا ہے کہ لولا علی لہلک عمرؑ اس مذہب والے حضرت امام جعفر صادقؑ کی حدیثوں کو مانتے ہیں۔ وضو کے لئے لکھا ہے وضو اس ترتیب کے ساتھ ہونا چاہیے جیسا قرآن پاک میں لکھا ہے۔ پاؤں دھونے کے بارے میں وار حکم، اس لئے پاؤں کے مسح کو فرض ماننا نہیں اور پورے پاؤں دھونے کو مستحب کہتے ہیں۔ نماز میں تعدیل ارکان کو لازمی لکھا ہے۔ نماز میں ہاتھ نہیں باندھتے ہیں مالکیوں کی طرح ہاتھ چھوڑے رکھتے ہیں۔